ڈاکٹر فخر الحق نوری

صدر شعبہ اردو، اورینٹل کالج ، لاہور

ن م راشد: مروّجہ تہذیبی و مذہبی تصوّرات کا انتقاد

Dr. Fakhar-ul-haq Noori

Head of Urdu Department ,Oriwental College Lahore

Noon Meem Rashid: A Critic of Prevailing Civilizational and Religious Concepts

N.M. Rashed, at many places of his prose and poetry, has criticized traditional cultural and religious ideas. Its primary reason is that he instead of taking interest in the past of human, took interest in the future. Secondly he had a complaint to the God who favoured the west but disregarded the east. Therefore he adopted the rebellious attitude. But this thing does not prove him a non-believer. He got light and guidance from his religious and cultural resources. Its proof is his prose as well as his poetry. This article is consisted of the study of Rashed's poetry related to it.

راشد کی شاعری کا ایک نہایت اہم فکری زاویہ مروّجہ تہذیبی و مذہبی تصوّرات کی توڑ پھوڑ اور روایت شکنی سے عبارت ہے۔ وہ اپنے سینے میں مشرق اور اہل مشرق کا درد بھی رکھتے ہیں۔ تمام تر آزاد خیالی کے باوجود مذہب کے بعض عناصر بھی ان کے دل و دماغ سے نکلنے نہیں پاتے۔ لیکن پھر بھی وہ ان دونوں حوالوں سے روایتی تصوّرات کی شکست و ریخت کرتے نظر آتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ مروجہ خیالات پر اکتفا کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں اور اس ضمن میں ایک منفرد نقطۂ نگاہ رکھتے ہیں۔ لیکن اس منفرد نقطۂ نگاہ کی تشکیل میں ان کے عہد کے شعور کو بھی بڑا دخل ہے۔ اس کی تفصیل میں جانے سے قبل ہم یہاں کرشن چندر کا ایک طویل اقتباس درج کرتے ہیں جو ان کے رقم کردہ ماورا کے 'تعارف' کا حصّہ ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''راشد کی شاعری جنگ عظیم کے بعد کی شاعری ہے۔ بظاہر یہ زمانہ انقلاب کا ہے۔ اس دور میں ایشیا کے اکثر حصوں میں صنعتی، معاشرتی اور سیاسی بیداری پیدا ہوئی ہے۔ انتخابات، جمہوریت اور عوام کی رائے دہندگی کے ہنگامے ہیں۔ قدیم ، فرسودہ، گندے معاشرتی نظام کو تباہ کر دینے کی آرزوؤں اور اِرادوں کے چرچے ہیں۔ وطنیت کی ایک لہر ہے جو ایشیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پھیلتی چلی جا رہی ہے۔ ہندوستان میں بھی جہاں ان نئے ارمانوں کے سایوں میں

ملک کے شاندار مستقبل کے خاکے کھینچے جا رہے ہیں وہاں ایک نئے ادب کی بھی بنیاد رکھی جا رہی ہے۔ چنانچہ شاعری میں بھی خودی، آزادی اور مزدور کی عظمت کے چرچے ہیں۔ ایک سطحی، جذباتی قسم کی وطن پرستی اور ایک موہوم نئے دور کی آمد میں رجائی نغمے گائے جا رہے ہیں۔ لیکن راشد کی نگاہیں کچھ اور ہی دیکھ رہی ہیں۔ راشد کو یہ سب ولولے، یہ سب دعوے ہنگامی اور وقتی معلوم ہوتے ہیں۔ اس کے خیال میں ارضِ مشرق کی روح اگر مر نہیں چکی تو قریب مرگ ضرور ہے۔ مشرقی نظام زندگی فرسودہ ہو چکا ہے۔ اس کا مذہب، اس کا تمدّن اب اپنی آخری ہچکیاں لے رہا ہے۔ راشد کی شاعری میں اس اعصابی تکان، ذہنی جمود، شکستہ ایمان اور حد سے بڑھے ہوئے احساسِ کمتری کا پتہ ملتا ہے جو صدیوں سے ارضِ مشرق پر طاری ہے۔ راشد سمجھتا ہے کہ اب اس بیمار کے اچھا ہونے کی کوئی امید نہیں۔ اسے اب مر ہی جانا چاہیے۔ مرنے کی یہ خواہش جو مشرقی روح کی مٹتی ہوئی زندگی کا عکس لطیف ہے، راشد کی شاعری میں بار بار آتی ہے۔ راشد کو مشرق کی موت ناگزیر نظر آتی ہے لیکن اسے اس کا سسک سسک کر مرنا بہت ناگوار ہے۔ یہ احساسِ شدید جو مشرق کے تنزلِ حیات سے ہویدا ہے، اس کی قوتِ متخیّلہ پر پوری طرح چھا گیا ہے اور بار بار کوندے کی طرح یاسیت کے کہرے میں لپکتا ہے۔۔۔مشرقی روح کے مٹ جانے کی خواہش کا اظہار دورِ جدید کی شاعری میں راشد کے سوا کسی شاعر کے کلام میں موجود نہیں کیونکہ ہمارے اکثر شاعر ایک نام نہاد رجائی شاعری کے جال میں گرفتار ہیں۔ یہ خواہش راشد کے جوہر کا جزو لاینفک ہے اور حالات کی صحیح آئینہ دار۔ راشد کو کسی نام نہاد خودی کا زعم نہیں۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ یہ شےءِ لطیف اب مشرق میں نایاب ہوتی جا رہی ہے۔'' (۱)

کرشن چندر کی یہ رائے تجزیہ طلب ہے۔ اسے تسلیم کرنے سے قبل اس پہلو کا ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ یہ رائے محض 'ماورا' کی نظموں کو سامنے رکھ کر دی گئی ہے۔ راشد نے اس مجموعے کے بعد ذہنی، فکری اور تخلیقی ارتقا کے کئی مرحلے عبور کیے جس کا حاصل 'ایران میں اجنبی'، 'لا=انسان' اور 'گماں کا ممکن' جیسے بلند پایہ شعری مجموعے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کرشن چندر کے سامنے راشد کا مذکورہ فنی مستقبل تھا اور نہ ہو سکتا تھا۔ چنانچہ ان کی کچھ باتیں قابل قبول ہونے کے باوجود بعض انتہا پسندانہ نکات تسلیم کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ بلکہ جس شدّت اور غلو کا اظہار انھوں نے ارضِ مشرق کی موت، مشرقی نظامِ زندگی اور مذہب و تمدّن کی فرسودگی و قریب المرگی، روحِ مشرق کی خواہش مرگ، حد سے بڑھے ہوئے احساسِ کمتری اور یاسیت کے حوالے سے کیا ہے، اس شدّت اور غلو کا اطلاق تو 'ماورا' کی نظموں پر کرنا بھی دشوار ہے۔ بہر حال راشد کی پوری شعری کائنات کی سیّاحی کرنے کے بعد بھی یہ احساس ضرور ابھرتا ہے کہ وہ حال اور مستقبل کے انسانی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ورثے میں ملنے والی تہذیب اور مذہب کو نہ صرف یہ کہ ناکافی سمجھتے تھے بلکہ وہ انھیں زوال و انحطاط کا شکار اور اہل مشرق کے زوال و انحطاط کا ذریعہ بھی تصوّر کرتے تھے۔ اس کا بڑا سبب نئی مغربی تہذیب کی یلغار، مذہب بیزار فلسفیوں کے افکار و خیالات کی آمد، مغرب اور اہل مغرب کی تمدّنی ترقی اور سیاسی و معاشی برتری ہے جس سے راشد اور ان کی نسل مرعوب تھی۔ لیکن یہ ایک دوسری طرح کی غلط فہمی ہوگی، اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ راشد مغربی تہذیب کو بھی عالم انسانی کے تمام امراض کا حل سمجھتے تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو ان کے ہاں مغرب کے خلاف سیاسی بغاوت، انتقام اور مزاحمت کا سراغ بھی نہ ملتا جو ان کے شعری موضوعات کا ایک بہت بڑا میدان ہے۔ وہ تو ایک ان دیکھی دنیا کے متلاشی تھے جہاں تہذیبوں کی کشاکش، مذاہب کا تصادم اور علاقائی تعصّبات کی تفریق نہ ہو۔

’تہذیب‘ اور ’مذہب‘ لغوی اعتبار سے ہی ہم علاقہ الفاظ نہیں ہیں بلکہ ان کے مابین عملی سطح پر بھی بڑا گہرا تعلق ہے۔ جہاں تہذیب کی تشکیل میں بہت سے زمینی اور افقی عناصر کارفرما رہتے ہیں وہاں آسمانی اور عمودی عناصر بھی اپنا کردار ادا کرتے رہتے ہیں جن کا تعلق مذہب کے ساتھ ہوتا ہے۔ یوں مذہب تہذیب کے دائرے میں دخیل ہو جاتا ہے۔ تہذیب اور مذہب کے باہمی تعلق کا سب سے بڑا حوالہ ’ماضی‘ ہے۔ گذشتہ صدیوں کی اقدار و روایات ہی کسی خاص تہذیب اور مذہب کی پہچان بنتی ہیں۔ راشد کے یہاں ماضی کی روایتوں، مذہبی قدروں اور تہذیبی لاشعور کے سرچشموں سے فکری و فنی دونوں سطحوں پر اکتساب و استفادہ کے وافر عملی ثبوت ملتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ نسل در نسل خون میں رچ بس کر آگے بڑھتی ہوئی اقدار و روایات کے حصار کو توڑنا محال ہوتا ہے لیکن راشد نے بارہا ماضی سے عدم دلچسپی کا ’اعلان‘ کیا ہے۔ مثلاً ’لا = انسان‘ میں شامل ’ایک مصاحبہ‘ کا مندرجہ ذیل اقتباس دیکھیے:

> ’’مجھے اعتراف ہے کہ مجھے ماضی سے کوئی دلچسپی نہیں، خواہ وہ کسی رنگ میں کیوں نمودار نہ ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ اصل مسئلہ آئندہ ہزاروں سال کا ہے گذشتہ ہزاروں سال کا نہیں۔ ماضی کے اندر یا ماضی کے جمع کیے ہوئے تجربات کے اندر آئندہ کے مسائل کی کلید کہیں موجود نہیں۔ اس تیز رو اور گریز پا حال میں بھی ماضی کا کوئی تجربہ ہمارا دستگیر نہیں ہو سکتا۔ زندگی کے سب بُعد آج نئے ہیں اور آئندہ نئے سے نئے بُعد نمودار ہوتے رہیں گے۔ جو لوگ ماضی کے پرستار ہیں اور ماضی کی امانتوں کو برقرار رکھنے پر مصر ہیں وہ محض سہل انگار ہیں۔ وہ ہر نئے تجربے سے ڈرتے ہیں۔ زندگی کی حرکتِ رفتار ان کی فہم سے بالا ہے۔ وہ زندگی کے کسی موجود بُعد کو نہیں دیکھ سکتے۔ وہ زندگی کی آئندہ جھلک کیسے دیکھ سکیں گے؟ لیکن شاعر اور ادیب کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ وہ عوام کو زندگی کے نئے نئے بُعد دیکھنے کے قابل بنائے۔ اور اس طرح ان کا مستقبل ان پر روشن تر کرتا چلا جائے۔‘‘ (۲)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ راشد کے نزدیک انسانی زندگی میں اصل اہمیت مستقبل کی ہے۔ ماضی ان کے خیال میں غیر اہم ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا ماضی اور مستقبل میں کوئی تضاد کا رشتہ ہے یا مستقبل کو روشن تر کرنے کے لیے ماضی سے بھی روشنی حاصل کی جا سکتی ہے؟ راشد نے اس سوال کا جواب یا کم سے کم مثبت جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔ یوں بھی ان کے کلیات میں ایسی نظمیں کم ہی ملتی ہیں جن میں کلی طور پر تہذیب و مذہب کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اکثر اوقات تو انھوں نے دوسرے موضوعات پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے تہذیب و مذہب کے بارے میں بھی رائے زنی کر دی ہے۔ بہر حال ان بکھرے ہوئے حوالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ راشد ماضی کے بجائے مستقبل میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ رہا معاملہ حال کا تو اس سے تو کسی کو مفر نہیں۔

جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا گیا، راشد کے عہد کا انسان، بہت بڑی سماجی و معاشرتی تبدیلیوں سے دوچار تھا۔ اس کا حال اس کے ماضی سے بہت مختلف تھا۔ ایسی صورت میں ماضی کے ساتھ موجود رشتوں کا کمزور پڑ جانا کچھ ایسا بعید نہیں تھا۔ راشد خود کہتے ہیں:

> ’’...بیسویں صدی تک پہنچتے پہنچتے ہمیں اپنے بدلتے ہوئے سیاسی، اقتصادی اور اجتماعی حالات نے ایک نئی انسانی مساوات کے روبرو لا کھڑا کیا تھا۔ ہمارے قدیم معاشرے کی بنیاد مذہب (اپنے تمام اخلاقی تصوّرات کے ساتھ) تصوّف (جس میں ہم جنسی کے عناصر شامل ہو گئے تھے) اور جاگیرداری (جو انسانی تعلقات کی تنہا قدر مشترک رہ گئی تھی) پر قائم تھی۔ لیکن ہمارے دیکھتے دیکھتے یہ تینوں ’ستون‘ کھوکھلے ہونے لگے تھے۔ ان کی جگہ سیاسی کشمکش

،اقتصادی بہتری کے تصوّرات اور اجتماعی دفاع کی اقدار وغیرہ نے لے لی تھی۔ وہ تمام علوم وفنون جو ہمارے بزرگوں کو آ ذوقہ ءحیات بخشتے تھے، بدل چکے تھے۔ اب مدرسوں میں مذہب،تصوّف،فقہ اور منطق وغیرہ کی جگہ حساب،تاریخ،جغرافیہ اور سائنس اور کالجوں میں ان مضامین کے علاوہ مغربی ادب،مغربی فلسفہ،اقتصاد،علم نفس وغیرہ پڑھائے جانے لگے تھے۔ اس نئی انسانی مساوات یا اس نئے انسانی 'تجربے' کی ترجمانی یا اس سے اثر پذیری ایک مجبوری تھی۔'' (۳)

اس کا لازمی نتیجہ ماضی سے تعلق کی کمزوری کی صورت میں نمودار ہوا۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنے مضمون 'بغاوت کی ایک مثال ـــــ ن م راشد' میں اس پہلو کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''...اس دور کا فرد ماضی سے تو اپنے تمام رشتے منقطع کر لیتا ہے لیکن مستقبل سے بھی کوئی پائیدار رشتہ استوار نہیں کر سکتا۔ اور نتیجتاً ایک عجیب سے خلفشار میں مبتلا ہو کر لڑکھڑاتا پھرتا ہے۔ نئے زمانے میں فرد کی جذباتیت،انتقامی روش اور تخریبی انداز کا باعث یہی نفسیاتی کش مکش ہے۔ راشد کی نظموں میں فرد کی اس ذہنی کش مکش اور اس کے نتائج کو پہلی بار منظر عام پر آنے کا موقع ملا ہے اور راشد کی شاعری فی الاصل فرد کی اس بغاوت کی ایک نہایت سچی مثال ہے۔''(۴)

ڈاکٹر وزیر آغا کا مذکورہ بالا مضمون 'ماورا' کی شاعری کے حوالے سے قلمبند کیا گیا ہے۔ اس دور کے فرد کو ماضی کے حوالے سے جس ذہنی کشمکش سے گزرنا پڑ رہا تھا،اس کی اس مضمون میں صحیح عکاسی کی گئی ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ بعد میں راشد کی شاعری میں مستقبل کا زیادہ واضح اور زیادہ مضبوط تصوّر سامنے آیا۔ بہر حال ماضی اور اس کی روایات سے عدم دلچسپی کا دعویٰ بعد میں بھی برقرار رہا۔ مزید یہ کہ بعد میں تو راشد کی شاعری میں اس خاص حوالے سے بھی کسی قدر فکری عنصر در آیا مگر شروع شروع میں اس میں جذباتیت زیادہ تھی۔ اس ضمن میں وارث علوی لکھتے ہیں:

''خدا،مذہب،ماضی اور مشرقی روحانیت کی طرف راشد کا نقطۂ نظر ایک ترقی پسند باغی کا نقطۂ نظر ہے۔ راشد مشرق کی سماجی پستی،زبونی اور سیاسی غلامی کا سبب تاریخی قوتوں میں نہیں بلکہ مشرق کی بوسیدہ روحانیت،قناعت پسندی اور عافیت کوشی میں دیکھتا ہے۔ راشد کا الحاد بھی نتیجہ ہے اسی باغیانہ ذہن کا جس کی تربیت میں فکر سے زیادہ جذباتی اضطرار کو دخل ہے۔ ...راشد کی نظر میں آج کے انسان کے لیے ماضی ایک بند کتاب کی مانند ہے۔ راشد محسوس کرتا ہے کہ ماضی کی جانب مڑ کر دیکھنے والا تو کہانی کے شہزادے کی طرح پتھر بن جاتا ہے۔ نئے انسان کی جولاں گاہیں مدائن کے کھنڈروں میں نہیں بلکہ نئی بستیوں میں تلاش کرنی چاہئیں۔ ...راشد کے یہاں ماضی کے خلاف جو اتنا شدید ردِعمل ملتا ہے،اس کا ایک سبب تو مشرقی مزاج کی ماضی پرستی اور روایت پسندی ہے اور دوسرا ہندو پاک کی وہ احیائی تحریکیں ہیں جو انسان کے نئی دنیا کی تعمیر کے حوصلوں کو کچل کے رکھ دیتی ہیں۔'' (۵)

اسی طرح وارث علوی نے راشد کے مذکورہ رویے کی ایک توجیہ مشرقی تہذیب میں روح اور مادے کی بڑھتی ہوئی ثنویت کے ردِ عمل میں بھی تلاش کرنے کی سعی کی ہے۔ بہر حال متعدد اسباب کی بنا پر راشد ماضی سے عدم دلچسپی کا اظہار کرتے تھے۔

جیسا کہ بیان ہوا، مذہب کا تصوّر بھی ماضی کے تصوّر کے ساتھ وابستہ ہے۔ جہاں راشد نے ماضی کے ہر رنگ سے عدم دلچسپی کا

اظہار کیا ہے، وہاں مذہب کے بارے میں بھی بارہا منفی تاثر دیا ہے۔ مثلاً 'ماورا' کے دیباچے میں رقمطراز ہیں:

''...(مذہب) نے ہمیں کافی بالذات ہونا سکھایا ہے۔ اس کا ایک نتیجہ تو یہ ہے کہ اس سے ہماری انفرادیت کی نشو ونما بہت حد تک رک گئی ہے۔ کیونکہ ہر مذہبی خاندان کا بچہ اپنے جسم اور رُوح پر ایک ایسی مہر لیکر پیدا ہوتا ہے جو عمر بھر اسے ایک مخصوص گروہ سے وابستہ اور ہم آہنگ کیے رکھتی ہے۔ دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ ہم اپنے تصوّرات پر خارجی اثرات قبول کرنے کے قابل ہی نہیں رہے۔ اور جہاں کسی خارجی اثر کا نشان پاتے ہیں محتاط ہو کر مدافعت پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اس سے مذہب کی تخفیف مقصود نہیں لیکن یہ کہے بغیر بھی چارہ نہیں کہ ہمارے مذہب نے ہماری انفرادیت کو غیر ضروری حد تک صدمہ پہنچایا ہے۔ اور خود فکری کے اس نایاب جوہر کو جو ادبیات اور تہذیب کے فروغ اور ترقی کے لیے ضروری ہے، آہستہ آہستہ محدود کر دیا ہے۔'' (۶)

اسی طرح قدرے ملفوف انداز میں 'لا=انسان' کے مصاحبے میں کہتے ہیں:

''جہاں تک مذہب کا تعلق ہے، اس کے بارے میں کسی آزادانہ نقطۂ نظر کا اظہار کرنا مشکل ہے۔ جیسے فلک پیمانے لکھا ہے، خوش قسمتی سے ہماری شاعری میں مذہب کے بارے میں اظہارِ خیال کی ایک بیش بہا روایت چلی آتی ہے۔ وہی باتیں نثر میں کہنے والے اکثر سولی پر چڑھا دیے گئے ہیں۔'' (۷)

اس اعتبار سے راشد بھی خوش قسمت ہیں کہ انھوں نے نثر میں مذہب کے بارے میں وہ کچھ نہیں لکھا جو کچھ شاعری میں لکھ دیا ہے۔

مذہب کے حوالے سے جب ہم راشد کی شاعری کا ارتقائی مطالعہ کرتے ہیں تو نومشقی کے بالکل ابتدائی زمانے میں وہ ایک مذہبی خاندان کے ایسے بچے کی صورت میں سامنے آتے ہیں جس کے جسم و روح پر مخصوص عقاید کی مہر لگی ہوئی ہے اور وہ حمد و نعت لکھنے اور پڑھنے کا شوق رکھتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ دوسری اکابر مذہبی شخصیات سے بھی اظہارِ عقیدت کرتا ہے۔

مثلاً:

کیا فائدہ ہے دعویِ عشقِ حسینؓ سے
سر میں اگر وہ شوقِ شہادت نہیں رہا (۸)

یوں لگتا ہے جیسے راشد کا ذہن اس وقت تک کشمکش سے بیگانہ تھا۔ 'ماورا' تک پہنچتے پہنچتے ان کا ذہن کشمکش سے دوچار ہو چکا تھا جس کا 'مکافات' میں عمدہ اظہار ہوا ہے۔ ایک طرف حضرت یزداں سے دوستی اور اہرمن سے دل کی ستیزہ کاری کا دعویٰ ہے تو دوسری طرف گناہوں کو جوانی سے بہرہ یاب اور جوانی کو گناہ کی حلاوتوں سے بھر لینے کی حسرت پریشان کر رہی ہے۔ اور پھر بالآخر نظم 'گناہ' میں حضرت یزداں کی دوستی کو دھچکا لگتا ہے اور گناہ روح پر چھا جاتا ہے۔ چنانچہ مذہب اور مذہبی عقاید کے حوالے سے راشد کی ذہنی کشمکش اور تشکیک کا اظہار مذکورہ نظموں ہی میں نہیں بلکہ 'ماورا' میں شامل اور بھی کئی نظموں میں ہوا ہے۔ مثلاً انسان کے دکھوں کا اظہار کرتے ہوئے راشد کہتے ہیں:

کسی سے دور یہ اندوہِ پنہاں ہو نہیں سکتا
خدا سے بھی علاجِ دردِ انساں ہو نہیں سکتا (انسان۔ ماورا)

اسی طرح راشد ایک خیالی دنیا کا تصوّر دیتے ہوئے یزدان واہرمن، دونوں کو وہاں سے دیس نکالا دے دیتے ہیں:

نہ خیر وشر ہے نہ یزدان واہرمن ہے یہاں
کہ جا چکے ہیں وہ اس سرزمینِ رنگیں سے (زندگی، جوانی، عشق، حسن۔ ماورا)

جس جگہ سے آسماں کا قافلہ لیتا ہے نور
جس کی رفعت دیکھ کر خود ہمّتِ یزداں ہے چُور
جس جگہ ہے وقت اک تازہ سرور
زندگی کا پیرہن ہے تارتار!
جس جگہ اہریمنوں کا بھی نہیں کچھ اختیار
مشرق ومغرب کے پار! (وادیِ پنہاں۔ ماورا)

یہ وہ رویہ ہے جس کے باعث راشد متعدد نظموں میں خدا کے بارے میں استہزائیہ انداز اختیار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ چند مثالیں اور دیکھیے:

پھول ہیں، گھاس ہے، اشجار ہیں، دیواریں ہیں
اور کچھ سائے کہ ہیں مختصر وتیرہ وتار،
تجھ کو کیا اس سے غرض ہے کہ خدا ہے کہ نہیں؟
دیکھ پتوں میں لرزتی ہوئی کرنوں کا نفوذ
سرسراتی ہوئی بڑھتی ہے رگوں میں جیسے
اوّلیں بادہ گساری میں نئی تند شراب
تجھ کو کیا اس سے غرض ہے کہ خدا ہے کہ نہیں (اتّفاقات۔ ماورا)

شبنمی گھاس پہ دو پیکرِ یخ بستہ ملیں،
اور خدا ہے تو پشیماں ہو جائے! (ایضاً۔)

مسکرا دے کہ ہے تابندہ ابھی تیرا شباب
ہے یہی حضرت یزداں کے تمسخر کا جواب (حزنِ انسان۔ ماورا)
کون جانے کہ وہ شیطان نہ تھا

بے بسی میرے خداوند کی تھی!　　　　(گناہ۔ ماورا)

اے مری شمعِ شبستانِ وفا،
بھول جا میرے لیے
زندگی خواب کی آسودہ فراموشی ہے!
تجھے معلوم ہے مشرق کا خدا کوئی نہیں
اور اگر ہے، تو سراپردۂ نسیان میں ہے　　　　(شاعرِ درماندہ۔ ماورا)

راشد نے خدا ہی کو نہیں، مذہب کے حوالے سے ان افراد کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا ہے جو معاشرے میں مذہبی ادارے کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن راشد کے نزدیک انھوں نے ذلّت کے سوا کچھ نہیں دیا۔ ان میں ملا کا کردار خاص طور سے ایسا کردار ہے جس نے دین کی اصل روح کو خاصا مسخ کیا ہے۔ اقبالؔ نے بھی شاید اسی لیے ملا کو کڑی تنقید کا نشانہ بنایا تھا۔ راشد کا زاویۂ نگاہ اقبال سے مختلف ہے تاہم انھوں نے بھی ملا کی تضحیک کو ضروری سمجھا ہے:

اسی مینار کو دیکھ
صبح کے نور سے شاداب سہی
اسی مینار کے سائے تلے کچھ یاد بھی ہے
اپنے بیکار خدا کی مانند
اونگھتا ہے کسی تاریک نہاں خانے میں
ایک افلاس کا مارا ہوا ملّائے حزیں
ایک عفریت ___ اداس
تین سو سال کی ذلّت کا نشاں
ایسی ذلّت کہ نہیں جس کا مداوا کوئی!　　　　(دریچے کے قریب۔ ماورا)

اس نظم میں موجود ملّائے حزیں کے کردار کی وضاحت راشد نے خود بھی کی ہے۔ آغا عبدالحمید کے نام 21 جولائی 1939ء کو دلّی سے رقم کردہ خط میں لکھتے ہیں:

"... میرے نزدیک ہمارا 'ملّا' ہماری Under World کی شخصیت بن چکا ہے۔ اس نظم میں اس کا ذکر انھی معنوں میں ہے۔" (۹)

آغا عبدالحمید نے اس خط کا جواب دیا ہوگا۔ 12 اگست 1939ء کے لکھے ہوئے جواب الجواب میں راشد رقمطراز ہیں:

''اس نظم سے میرا عندیہ یہ ہے کہ میناروں کی رفعت ہماری گزری ہوئی عظمت کا نشان سہی، فطرت انھیں ہر صبح چومتی سہی۔ لیکن انھیں کے نیچے ایک نہاں خانوں کا باشندہ پڑا ہے جو ہماری گذشتہ تین سو سال کی ذلّت کا جیتا جاگتا نشان ہے۔'' (۱۰)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ راشد کی اصل پریشانی مشرق کی ذلّت ہے۔ چونکہ وہ اس کا ذمّہ دار مذہب کو بھی سمجھتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ یہ مذہب کی بگڑی ہوئی صورت ہے، لہٰذا وہ اس سے متعلق کرداروں کو بھی طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔ مذکورہ بالا نظموں میں ان کا مذہب کے بارے میں کچھ ایسا روّیہ ہے جس پر اعتراضات ہوئے ہیں۔ کم سے کم ان کی لفظی سطح قابل اعتراض محسوس بھی ہوتی ہے۔ ایسی ہی نظموں کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی لکھتے ہیں:

''یہ نظمیں 'روحِ مشرق' کے المیے کا ایک موثر اظہار ہیں۔ ان نظموں کے کردار استعارہ ہیں اس انفعالیت، زوال پذیری، قوتِ نمو کے فقدان اور اپنے باطن سے بے خبری کا جو مشرق کے انسان کے اصل مسائل ہیں۔ جن کا ادراک نہ ہونے سے وہ اس کارزار میں ایک ہارے ہوئے سپاہی کی طرح ہے۔ جہاں اسے مغرب کی بڑھتی ہوئی قوتوں کا سامنا کرنا ہے۔ ان نظموں میں روایت، مذہب اور تصوّف کے ان جامد عناصر پر طنز و استہزا بھی ہے جو اس کردار کی انفعالیت اور شکست کی ذمّہ دار ہیں۔ ایسی ہی نظموں کے اقتباسات کی بنا پر راشد کی بے دینی اور گستاخانہ طرزِ کلام کو مطعون کیا گیا۔''(۱۱)

اس طرح کی گستاخیاں 'ماورا' کے بعد کے مجموعوں میں بھی نظر آ جاتی ہیں۔ راشد کا یہ گستاخانہ لہجہ 'ایران میں اجنبی' میں شامل، ایک نیگرو نظم سے متاثر ہو کر لکھی جانے والی نظم 'پہلی کرن' میں کچھ زیادہ ہی شدّت اختیار کر گیا ہے۔ اس میں خدا کو 'ساحرِ بے نشاں' قرار دے کر اس کا جنازہ نکال دیا گیا ہے اور اس 'واقعے' کو انسان کی برتری کے نئے دور کے حوالے سے 'مسرت کی پہلی کرن' سے تعبیر کیا گیا ہے:

خدا کا جنازہ لیے جا رہے ہیں فرشتے
اُسی ساحرِ بے نشاں کا
جو مغرب کا آقا تھا مشرق کا آقا نہیں تھا! (پہلی کرن۔ ایران میں اجنبی)

اگرچہ گذشتہ صفحات میں دیے گئے شعری اقتباسات میں بھی راشد کا خاص ہدف خدا ہی نظر آتا ہے لیکن مندرجہ بالا اقتباس میں تو انھوں نے خدا کی موت کا اعلان کر کے کچھ زیادہ ہی گستاخانہ لہجہ اپنا لیا ہے۔ یہ لہجہ بجا طور پر یہ سوال پیدا کرتا ہے کہ آیا راشد ملحد تھے؟ لیکن اگر وہ ملحد تھے تو انھیں بار بار خدا کے تصوّر پر ضرب لگانے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ کیا وہ اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے تھے یا خدا کے سامنے اپنی انانیت کا اظہار کر رہے تھے؟ اگر بغور دیکھا جائے تو راشد کو خدا کے قادرِ مطلق اور حاکم اعلیٰ ہونے سے انکار نہیں تھا۔ انھیں تو اس کے روّیے پر اعتراض اور اس کی کنارہ کشی سے شکایت تھی۔ کسی نہ کسی صورت میں یہ شکایت غالبؔ اور اس سے پہلے کے شاعروں کے ہاں بھی نظر آ جاتی ہے اور اقبالؔ اور ان کے بعد کے شعرا کے ہاں بھی اس کا وجود ملتا ہے۔ اقبال اور ان کے بعد کی پود نے تو اس ضمن میں جدید فلسفیانہ افکار سے بھی گہرا اثر قبول کیا۔ فرق یہ ہے کہ اقبال جیسے خدا پرست شاعروں کا دامن اس ضمن میں زیادہ آلودگی سے محفوظ رہا جبکہ راشد

جیسے انسان پرست شاعر اس سے محفوظ نہ رہ سکے۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ معاملہ تکذیب وتردید کا نہیں کنارہ کشی کا ہے جو خدا کی انسان سے بے نیازیوں کا ردِعمل بھی ہے۔اس سلسلے میں عالم خوندمیری نے اپنے عالمانہ مقالے 'ن م راشد، انسان اور خدا' میں اچھا تجزیہ کیا ہے۔جدید فلسفیانہ افکار کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''بے ربطی کائنات کا تصوّر انیسویں صدی کے آخر تک انسانی شعور کا ایک مشترک عنصر بن جاتا ہے۔جرمنی کے 'مجذوب فلسفی شاعر' نیطشے اور رُوس کے دستوفسکی نے انسانی فکر کے اس نئے عنصر کو پوری شدّت سے محسوس کیا۔نیطشے نے اعلان کیا کہ 'خدا مر چکا ہے' اور دستوفسکی نے انسانی آزادی اور خدا کے وجود کے اندرونی تضاد کو پیش کیا۔نیطشے کی خدا کی ذات سے یہ گستاخی بڑے گہرے معانی رکھتی ہے۔یہ خدا کی موت کا اعلان نہیں تھا بلکہ اس بات کا اظہار تھا کہ عصری انسانی زندگی سے خدا پراسرار طریقے پر 'کنارہ کش' ہو رہا ہے۔انسان سے خدا کی یہ 'کنارہ کشی' خالص مذہبی اصطلاح میں انسان کا خدا کی رحمت سے محروم ہو جانا ہے۔حساس مذہبی ذہن نے اسی واقعے کو 'خدا کی رحمت سے محرومی' قرار دیا۔ملحد نیطشے نے 'خدا کی موت' کا اعلان کیا اور مارکس نے مذہب کو انسانی ذہن کے لیے افیون کا نام دیا۔ایک اعتبار سے خدا کی غیبت (Absence) نری انسانیت (Humanism) کے رجحان کا انتہائی منطقی نتیجہ ہے۔مذہبی زبان میں اسے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ انسانی زندگی سے 'خدا کی کنارہ کشی' نری انسانیت کے رجحان سے پیدا ہونے والے انسانی تکبر کا 'خدائی ردِعمل' ہے۔اگر انسان اپنے آپ کو خود مکتفی تصوّر کرے تو خدا بھی انسان سے اپنے آپ کو جدا کر سکتا ہے۔انسان کی (Autonomy) اور خدا کی 'کنارہ کشی' دونوں ساتھ چلتے ہیں۔'' (۱۲)

راشد کی شاعری مذکورہ تصوّرات سے اثر پذیری کی مظہر ہے۔ان کے ہاں خدا کا انکار نہیں، کنارہ کشی ہے۔اور یہ انسانی موقف کی عطا بھی ہے اور خدا کی کنارہ کشی کا ردِعمل بھی۔یہ ردِعمل خاص طور سے مشرق اور اہل مشرق کی 'خدا کی رحمت سے محرومی' کا نتیجہ ہے۔راشد نے اس محرومی کو شدّت سے محسوس کیا ہے۔اسی شدّت کے باعث انھوں نے شکوے کی راہ اپنانے کے بجائے خدا کے وجود پر ضرب لگانے کا راستہ اختیار کیا ہے۔

خدا کے ساتھ راشد کے نزاعی رویے کی بنیادی وجہ اس کا وہ امتیازی سلوک اور ناانصافی ہے جو وہ مغرب اور مشرق کے مابین روا رکھتا ہے۔اس صورتِ حال کو دیکھ کر راشد کی مشرقی روح تڑپ اٹھتی ہے، جس کی توقعات اس خدا کے ساتھ وابستہ تھیں جس نے اپنی نوازشات مغرب کی جھولی میں ڈال دی ہیں۔چنانچہ ڈاکٹر وزیر آغا نے صحیح لکھا ہے:

''یہ نہیں کہ راشد خدا کے وجود کے منکر ہیں۔انھوں نے اپنی بہت سی نظموں میں مغرب کے خدا کے وجود کو تسلیم اور مشرق کے خدا کے وجود کا انکار کر کے دراصل خدا کی ناانصافی کو نشانۂ طنز بنایا ہے۔''(۱۳)

عبداللہ جاوید نے بھی اپنے مضمون 'ن م راشد' میں اسی خیال کو دہرایا ہے۔وہ رقمطراز ہیں:

''وہ الحاد کی منزل پر آ چکے ہیں مگر الحاد بھی سیدھا سادا الحاد نہیں کیونکہ اس کی بنیاد مذہبی نقطۂ نظر سے زیادہ سیاسی نقطۂ نظر پر قائم ہے۔وہ ایسے ملحد ہیں جنھیں مشرق کے خدا سے انکار ہے، مغرب کے خدا سے انکار نہیں۔یہاں ان کا جذباتی استدلال کافی الجھنیں پیدا کرتا ہے لیکن یہ بات کہ خدا مغرب کا آقا ہے، مشرق کا آقا نہیں ہے یا یہ کہ تجھے معلوم ہے

مشرق کا خدا کوئی نہیں، اور اگر ہے تو سراپردۂ نسیان میں ہے، نہ صرف سیاسی نقطۂ نظر سے متعلق ہے بلکہ ساتھ ہی ساتھ اس کے پس منظر میں مشرق کی معاشی بدحالی بھی کارفرما ہے۔'' (۱۴)

اس ساری بحث سے ظاہر ہوتا ہے کہ خدا کے وجود کی نفی کرنا راشد کا مقصود ہے اور نہ یہ ان کے بس میں ہے۔ خدا کے ساتھ ان کی لڑائی کے پیچھے اجتماعی انسانی محرومیوں، خصوصاً مشرق اور اہلِ مشرق کی کس مپرسی کا ردِعمل کارفرما ہے۔ خدا کی نفی سے تو خیر و شر کا تصوّر ہی معدوم ہو جاتا ہے۔ شروع شروع کی جذباتی نظموں سے قطع نظر، راشد کی شاعری خیر و شر کے تصوّر سے خالی کبھی بھی نہیں ہوئی۔ وارث علوی نے اس ضمن میں بڑے پتے کی بات کی ہے۔ لکھتے ہیں:

''باوجود الحاد کے راشد خدا سے انکار نہیں کرتا ــــ نہیں کر سکتا کیوں کہ خدا کا انکار کر دیجیے تو آپ خیر و شر کے تصوّر سے بالا ہو جاتے ہیں۔ پھر گناہ میں بھی لذّت نہیں رہتی۔'' (۱۵)

راشد کی شاعری کا زمانی تسلسل میں مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ خدا اور مذہب کے بارے میں ان کے مخالفانہ رویّے میں جذباتی شدّت وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کم ہوتی چلی گئی ہے اور یوں بھی مذکورہ رویّے کے اظہار میں زیادہ تسلسل و تواتر نہیں رہا۔ پھر بھی چند نظموں میں انھوں نے مذہب کے فرسودہ ہونے کا خیال ظاہر کرنے کے ساتھ ساتھ ملّا کو بھی طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ مثلاً ذیل کے ٹکڑے دیکھیے:

اے عشقِ ازل گیر و ابد تاب،
کچھ خواب کہ مدفون ہیں اجداد کے خود ساختہ اسمار کے نیچے
اجڑے ہوئے مذہب کے بنا ریختہ اوہام کی دیوار کے نیچے
شیراز کے مجذوبِ تنک جام کے افکار کے نیچے
تہذیبِ نگونسار کے آلام کے انبار کے نیچے! (میرے بھی ہیں کچھ خواب۔ لا=انسان)

یہ دیکھتے ہی
گلی کا ملّا بہت ہی رویا:
''خلا سے کچھ عرش کی خبر بھی؟''
(نفی میں کیسے نفی کا جویا) (بے سُرا الاپ۔ گماں کا ممکن)

روایت، جنازہ
خدا اپنے سورج کی چھتری کے نیچے کھڑا
نالہ کرتا ہوا
جنازے کے ہمراہ چلتے ہوئے
گھر کے بے کار لوگوں کا شور و شغب

ریا کار لوگوں کو شور و شغب کا سرور (نیا آدمی۔گماں کا ممکن)

لیکن اس انداز کے چند اقتباسات بھی خدا کے انکار کو ثابت نہیں کرتے۔ راشد نے اگر خدا سے چھٹکارا حاصل کرنے کی سعی کی بھی تو ان سے ایسا ہو نہیں سکا۔ ان کی عملی زندگی کے بعض معمولات و واقعات اور ان کی شخصیت کے بعض اوصاف و میلانات ہمارے موقف کی تائید کرتے ہیں۔(۱۶) حمید نسیم کا مندرجہ ذیل بیان بھی ان کی راشد کے ساتھ محض کسی جذباتی وابستگی کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ راشد کی زندگی اور شاعری میں اس کے وافر ثبوت موجود ہیں۔ پہلے حمید نسیم کا بیان دیکھیے اور بعد میں راشد کے چند شعری اقتباسات پر نگاہ ڈالیے تاکہ دعوے کے دلائل سامنے آ سکیں:

> ''میرے دل نے ہزار بار یہ گواہی دی ہے کہ شعر نو کا خدا اپنی جدت پسندی کی وجہ سے اپنی روحانی روایت سے ہٹ گیا۔ بہر حال اس کا دماغ کافر ہوا ہو تو ہوا ہو۔ دل اس کا مسلمان ہی رہا، کہ ہر اضطرار اور ہر اساسی معاملے میں اس نے اپنے عمل میں ثبوت دیا کہ وہ روایت سے کامل انقطاع حاصل نہیں کر سکا۔ میرا دل یہ بھی کہتا ہے کہ اصل پرکھ دل کے احوال پر منحصر ہوتی ہے۔''(۱۷)

راشد کی شخصیت کا یہی پہلو انھیں خدا کی طرف رجوع کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے دل کا درد بھی خدا کے سامنے رکھتے ہیں، درد کا مداوا بھی اسی سے چاہتے ہیں اور کسی ناپسندیدہ اور غیر اخلاقی واقعے پر جب ان کا دل بھر آتا ہے تو وہ آنسوؤں کا غبار بھی خدا ہی کے گھر کی دیوار کے ساتھ لگ کر نکالتے ہیں۔ خدا کا منکر تو کیے کے لیے تو کوئی اور جگہ بھی ڈھونڈ ہی سکتا تھا۔ اقتباسات دیکھیے:

''خدائے برتر،
یہ داریوشِ بزرگ کی سرزمیں،
یہ نوشیروانِ عادل کی دادگاہیں،
تصوّف و حکمت و ادب کے نگار خانے،
یہ کیوں سیہ پوست دشمنوں کے وجود سے
آج پھر اُبلتے ہوئے سے ناسور بن رہے ہیں؟'' (من و سلویٰ۔ایران میں اجنبی)

''خداوند!
کیا آج کی رات بھی
تیری پلکوں کی سنگیں چٹانیں
نہیں ہٹ سکیں گی؟'' (درویش۔ایران میں اجنبی)

میں خود اجنبی ہوں

مگر سُن کے یوں دم بخود ہو گیا تھا،
کہ جیسے مجھی کو وہ مارِ سیہ ڈس گیا ہو!
میں اُٹھا، خیاباں میں نکلا
اور اک کہنہ مسجد کی دیوار سے لگ کے
آنسو بہاتا رہا! (مارِ سیاہ۔ایران میں اجنبی)

یہی نہیں بلکہ وہ تو مادی زندگی کی لذّتیں بھی خدا سے مانگتے ہیں۔ ذرا دعائیہ انداز ملاحظہ ہو:

اے خدا، پھر سے انڈیل
میرے اس خالی پیالے میں
گناہوں کی شراب (نیا ناچ۔گماں کا ممکن)

حتیٰ کہ انھیں جس خدا سے شکاتیں ہیں، اس سے نجات دلوانے کی امید بھی خدا ہی سے رکھتے ہیں:

بزرگ و برتر خدا کبھی تو (بہشت برحق،)
ہمیں خدا سے نجات دے گا
کہ ہم ہیں اس سرزمیں پہ جیسے وہ حرفِ تنہا،
(مگر وہ ایسا جہاں نہ ہوگا) خموش و گویا،
جو آرزوے وصالِ معنی میں جی رہا ہو
جو حرف و معنی کی یک دلی کو ترس گیا ہو! (وہ حرفِ تنہا۔لا=انسان)

انھیں خدا کی چیخ سب صداؤں سے زندہ تر محسوس ہوتی ہے۔ کہتے ہیں:

تمھیں آن بھر میں خدا کی چیخ نے آلیا
____وہ خدا کی چیخ
جو ہر صدا سے ہے زندہ تر! (شہر میں صبح۔گماں کا ممکن)

مذہب اور خدا کے تصوّر کے حوالے سے راشد کے ہاں کچھ اور ابعاد بھی نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر انھوں نے 'سفر نامہ' میں عصر حاضر کی افسر شاہی کے تلازموں سے استفادہ کرتے ہوئے انسان کے 'خلیفتہ اللہ فی الارض' کی حیثیت سے زمین کی طرف ہجرت کے واقعے کو نظم کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس نظم کو لکھتے ہوئے راشد کے پیش نظر قرآنی تلمیح رہی ہے۔ انھیں انسان کی بہت سی قیمتی چیزیں خدا کے ساتھ نور

کے ناشتے میں شریک ہونے کی وجہ سے دیر ہو جانے کے باعث عرش پر رہ جانے کا ملال تو ہے مگر اس نظم میں وہ بہت بنیادی مذہبی عقیدہ بیان کرتے ہیں۔ساتھ ساتھ صوفیانہ رنگ کی آمیزش بھی نظر آتی ہے۔چند سطریں دیکھیے :

وہ تمام ناشتہ
اپنے آپ کو گفتگو میں لگا رہا:
''ہے مجھے زمیں کے لیے خلیفہ کی جستجو
کوئی نیک خو
جو مرا ہی عکس ہو ہُو بہو!''
تو امیدواروں کے نام ہم نے لکھا دیے
اور اپنا نام بھی ساتھ ان کے بڑھا دیا!
''مری آرزو ہے شجر حجر
مری راہ میں شب و روز
سجدہ گزار ہوں____
مری آرزو ہے کہ خشک و تر
مری آرزو میں نزار ہوں____
مری آرزو ہے کہ خیر و شر
مرے آستاں پہ نثار ہوں____
مری آرزو____ مری آرزو____'' (سفر نامہ۔گماں کا ممکن)

بعض نظموں میں تو راشد بھی اس کی آرزو میں نزار نظر آتے ہیں۔اس ضمن میں جو نظمیں دیکھی جا سکتی ہیں ان میں 'لا=انسان' کی 'ہمہ تن نشاطِ وصال ہم'۔'وہی کشف ذات کی آرزو'اور'چلا آ رہا ہوں سمندروں کے وصال سے'اور'گماں کا ممکن' کی 'مجھے وداع کر'اور'گماں کا ممکن____جو تو ہے میں ہوں' شامل ہیں۔مذہب کے بارے میں متعدد نشیب و فراز عبور کرنے کے بعد ان نظموں میں راشد اپنی اصل کی دریافت کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ایسی ہی نظموں میں ان کی تمنّا کا عمودی رخ افقی رخ پر صحیح معنوں میں غالب آیا ہے اور یہی وہ نظمیں ہیں جن میں راشد ذات کی غوّاصی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔اسے ماورائیت کہا جائے یا معرفت حق،راشد تصوّف کی مخالفت کرنے کے بعد بالآخر صوفیانہ افکار سے اثر قبول کرتے نظر آتے ہیں۔چنانچہ مذکورہ نظموں میں انھوں نے صوفیانہ خیالات اور جدید فلسفیانہ افکار کو باہم آمیز کر کے ایک ایسا فکری بُعد پیش کیا ہے جو کسی اور جدید اردو شاعر کے ہاں شاید ہی ملے۔یہاں وہ مذہب کے نہیں،ملّا کے مذہب کے منکر اور اس سے مختلف مذہب کے مؤید دکھائی دیتے ہیں۔لیکن یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ راشد کا غالب رجحان اپنی ذات کو انائے مطلق میں مدغم یا جذب کرنے کے بجائے اپنی ذات کو انائے مطلق سے الگ رکھتے ہوئے اس کے امکانات دریافت کرنے سے متعلق ہے۔عالم خوندمیری نے

اس کی تعبیر وتشریح کچھ یوں کی ہے:

''اس بے خدا دور میں انسان کو خدا کے برابر ہونا ہے۔ انسان ہی اس خلا کو پُر کر سکتا ہے۔ اس طرح نہیں کہ وہ اپنے آپ کو 'خدا' بنا لے یا 'أَنَـا رَبُّـکُمُ الْاَعْـلٰی' کا اعلان کرے بلکہ صحیح معنی میں اپنی حدّیت (Finitude) کا اعتراف کرتے ہوئے اور اس حدّیت کو اپنی نظروں میں رکھتے ہوئے اپنے وجود کا آپ گواہ بنے۔ کبھی انسان نے خدا کو انسان کے روپ میں دیکھا (Humanizing The Devine)، اور کبھی اس نے (جیسے فاؤسٹی دور میں) انسان کو خدا کے روپ میں دیکھنے کی کوشش کی (Divinizing Man)۔ لیکن مستند راستہ یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کی بازیافت کرے۔ راشد کی شاعری انسان کی بازیافت کی ایک جرات مندانہ (Heroic) کوشش ہے۔'' (۱۸)

لیکن راشد کی محولہ بالا نظموں کو دیکھتے ہوئے عالم خوندمیری کے تجزیے میں اس قدر اضافہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ راشد کے ہاں انسان کی بازیافت خدا کی بازیافت سے ہم آہنگ ہے۔ فاروق حسن نے اپنے انگریزی مضمون "Beyond Blasphemy and prayers: The Concept of God in Rashed's poetry" میں عالم خوندمیری کے مندرجہ بالا تجزیے کو پیش نظر رکھتے ہوئے لکھا ہے:

"Rashed's verse is undoubtedly about the discovery of man, but, as the evidence from Guman ka Mumkin reveals, that discovery is contingent upon the discovery of God, for ultimately, in Rashed's view, man and God are inextricably joined in their creative ability. There are hints all through Rashed's poetry that God may be located in man. In his early verse these hints are vague and unfocussed; they appear in their developed form only in "Hasan, the Potter." The issue that remains perpetually ambiguous or problematic in Rashed's poetry is that of the existence of an objective God in the universe." (19)

'حسن کوزہ گر' کی مثال تو بہت سامنے کی ہے، دو ایک اور نظموں کی مثالیں دیکھیے:

جو تجھے بلاتی ہے پے بہ پے\
وہ صدا اجلِ جاں کی ہے\
وہ صدا امروزِ ماں کی ہے!\
کسے اس صدا سے فرار ہو؟\
مرا دل گرو، مری جاں گرو\
تری کن مکن، تری رَو مَرو

مجھے بارِ جاں،
کہ میں حرف جس کا بیاں ہے تو
میں وہ جسم جس کی رواں ہے تو
تو کلام ہے، میں تری زباں
تو وہ شمع ہے کہ میں جس کی لَو! (وہی کشفِ ذات کی آرزو۔لا=انسان)

مگر یہ سچ ہے،
میں تجھ کو پانے کی (خود کو پانے کی) آرزو میں
نکل پڑا تھا
اُس ایک ممکن کی جستجو میں
جو تو ہے میں ہوں
میں ایسے چہرے کو ڈھونڈتا تھا
جو تُو ہے میں ہوں
میں ایسی تصویر کے تعاقب میں گھومتا تھا
جو تُو ہے میں ہوں! (''گماں کا ممکن ــــ جو تو ہے میں ہوں''۔گماں کا ممکن)

مذکورہ فکری حوالوں سے قطع نظر، فنی اعتبار سے بھی دیکھا جائے تو راشد کی شاعری مذہبی عناصر خصوصاً تلمیحات سے بھری پڑی ہے۔'خودکشی' (ماورا) میں دیوار کا تصوّر یاجوج ماجوج کے قرآنی قصے سے آیا ہے۔'سباویراں' (ایران میں اجنبی) میں 'سبا' اور 'سلیمان' قرآنی تلمیحیں ہیں۔'اسرافیل کی موت' اور 'ابولہب کی شادی' (لا=انسان) کے مرکزی کردار بھی قرآن کا فیضان ہیں۔'زمانہ خدا ہے' (لا=انسان) کا تو عنوان ہی اس حدیث قدسی سے لیا گیا ہے کہ 'لَا تَسُبُّو الدَّھرَ فَاِنِّی اَنَا الدَّھر'. یہ سب حوالے راشد کے مذہبی پس منظر کو بھی ظاہر کرتے ہیں اور ان سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ وہ اپنی فکر و دانش کو مذہب کے سرچشموں سے کس قدر سیراب کرتے تھے۔

جیسا کہ گذشتہ صفحات میں بیان کیا گیا، راشد نے بارہا ماضی سے عدم دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔مذہب اور تہذیب اسی کی ذیل میں آتے ہیں۔مذہب تو زیر بحث آ چکا، اب مذہبی مباحث سے قطع نظر کرتے ہوئے دوسرے تہذیبی آثار کے حوالے سے بھی مختصر طور پر گفتگو کر لی جائے۔اگرچہ کوئی بھی شخص اپنے تہذیبی لاشعور سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتا لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر کسی کو ماضی کے ساتھ یکساں طور پر دلچسپی ہو۔اگر ایک شخص ماضی کی روایات و اقدار کے بغیر ایک قدم چلنے کا حوصلہ بھی نہیں رکھتا تو دوسرا شخص ایسا بھی ہوسکتا ہے جو حال اور مستقبل کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ماضی سے لاتعلق ہونے میں ہی عافیت محسوس کرتا ہو۔راشد کا شمار دوسری طرح کے لوگوں میں ہوتا ہے۔ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے الفاظ میں

''راشد کی شاعری میں ماضی مستقل طور پر لاحاصلی، انفعالیت اور بے معنویت کی علامت کے طور پر موجود ہے۔ جہاں جہاں بھی ماضی کا حوالہ نمودار ہوا ہے اس کا تصوّر انحطاط اور بے معنویت ہی سے وابستہ نظر آتا ہے۔ ماضی کے ساتھ ان کا برتاؤ خاصا بے رحمانہ ہے۔ اس تصوّر کے ساتھ ہی ان کے اندر برہمی، اضطراب اور اکتاہٹ طاری ہو جاتی ہے۔''(۲۰)

کلیاتِ راشد کا مطالعہ اس رائے کی تصدیق کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ راشد نے ماضی سے خاصی بیزاری کا اظہار کیا ہے۔ یوں تو ماضی اور اس کے تہذیبی ورثے کے خلاف 'ماورا' کی بعض نظموں میں بھی اشارے مل جاتے ہیں لیکن چونکہ ابھی راشد کی شاعری کے فکری عناصر اپنی تشکیل کے ابتدائی مرحلوں میں تھے اس لیے یہ مجموعہ تہذیبی مباحث کے حوالے سے کچھ زیادہ فکر انگیز نہیں ہے۔ بعد میں یہ مباحث ان کی شاعری میں بڑھتے چلے گئے۔ چنانچہ مشرقی تہذیب کی روایات واقدار سے انحراف اور ماضی سے عدم دلچسپی کا رویہ 'ماورا' کے بعد کے تینوں شعری مجموعوں میں شامل بہت سی نظموں میں کھل کر سامنے آیا ہے۔ اس ضمن میں طلسمِ ازل، نارسائی (ایران میں اجنبی)، ریگِ دیروز، زندگی اک پیرہ زن، آرزو راہبہ ہے، بے پروبال، نئی تمثیل (لا=انسان)، شہرِ وجود اور مزار، یارانِ سرِ پُل، نئے گناہوں کے خوشے اور زنجیل کے آدمی (گماں کا ممکن) جیسی نظمیں دیکھی جاسکتی ہیں۔ راشد کے نقطۂ نظر کو سمجھنے میں 'نارسائی' کی یہ سطریں کلیدی اہمیت رکھتی ہیں:

کہا ساحرہ نے:
''کہ اے شاہزادے
رہِ جستجو میں
اگر اس لق ودق بیاباں میں
دیکھا پلٹ کر،
تو پتّھر کا بت بن کے رہ جائے گا تو!''
جہاں سب نگاہیں ہوں ماضی کی جانب
وہاں راہرو ہیں فقط عازم نارسائی (نارسائی۔ ایران میں اجنبی)

راشد اپنا رخ ماضی کی جانب کر کے عازم نارسائی اور پتھر کا بت نہیں بننا چاہتے۔ وہ آگے ہی آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ کبھی وہ ماضی کی روایات واقدار پر طنز کرتے ہیں اور کبھی ماضی پرستوں کے خلاف اظہارِ خیال کرتے ہیں۔ چند مثالیں دیکھیے:

ہم محبّت کے خرابوں کے مکیں
وقت کے طولِ المناک کے پروردہ ہیں
ایک تاریک ازل، نورِ ابد سے خالی!
ہم جو صدیوں سے چلے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ ساحل پایا
اپنی تہذیب کی پاکوبی کا حاصل پایا! (ریگ دیروز۔ لا=انسان)

زندگی، تو اپنے ماضی کے کنویں میں جھانک کر کیا پائے گی؟
اس پرانے اور زہریلی ہواؤں سے بھرے، سُونے کنویں میں
جھانک کر اس کی خبر کیا لائے گی؟
____اس کی تہ میں سنگریزوں کے سوا کچھ بھی نہیں
جُز صدا کچھ بھی نہیں! (زندگی اک پیرہ زن۔ لا=انسان)

____ان کے چہرے زرد، رخسارے اُداس____
درد کی تہذیب کے پیرو،
ہزاروں سال کی مبہم پرستش،
یہ مگر کیا پا سکے؟
آہ کے پیاسے، کبھی اشکوں کے متانے رہے
اپنے بے بس عشق کو عشقِ رسا جانے رہے!
ہر نئی تمثیل کے معنی سے بیگانے رہے! (نئی تمثیل۔ لا =انسان)

اس حوالے سے راشد کی ایک نظم 'بے پروبال' خاص طور سے دیکھی جا سکتی ہے۔ راشد کے اپنے بقول:

''اس نظم کا موضوع سادہ الفاظ میں یہ ہے کہ اصل تلاش کسی سلطنت گمشدہ کی نہیں جس کے فریب میں اکثر قومیں انحطاط کے زمانے میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ بلکہ اصل تلاش ان زندہ مسائل کی ہے جو انسانوں کو ہمیشہ سے درپیش رہے ہیں، اور جن کو صرفِ نظر کرنا گویا کسی واہمے کا تعاقب کرنا ہے۔'' (۲۱)

جب کسی سلطنتِ گم شدہ کے خواب
کبھی اشک، کبھی قہقہہ بن کر دلِ رہرو کو لبھاتے جائیں
وہ کبھی سرخیِ دامن میں
کبھی شوقِ سلاسل میں
کبھی عشق کی للکار میں لوٹ آتے ہیں
بے پروبالیِ انساں کی شبِ تار میں لَوٹ آتے ہیں
جی کے آزار میں لوٹ آتے ہیں (بے پروبال۔ لا=انسان)

دوایک اقتباس مزید دیکھیے:

نہیں ــــــ
روایت کی لوریوں نے
کلام کی روشنی کو اِن پر
سُلا دیا ہے! (نئے گناہوں کے خوشے۔گماں کا ممکن)

کئی بار میں نے ــــــ نکل کے چوک سے ــــــ سعی کی
کہ میں اپنی بھوتوں کی میلی وردی اتار دوں
نئے بولتے ہوئے آدمی کے نئے الم میں شریک ہوں
میں اُسی کے حسن میں، اس کے فن میں، اسی کے دم میں شریک ہوں
میں اسی کے خوابوں، انھی کے معنیِ تہ بہ تہ میں
انھی کے بڑھتے ہوئے کرم میں شریک ہُوں ــــــ
وہ تمام جو ہے ــــــ وہ شاہ دولا کے ارجمند ــــــ
ہر ایک بار اچھل پڑے ــــــ مرے خوف سے
مرے جسم و جاں پہ ابل پڑے! (زنجبیل کے آدمی۔گماں کا ممکن)

اس آخری اقتباس میں تو راشد نے ان روایت پرستوں کی خوب تخفیف کی ہے جو خود بھی حال کے انسانوں میں نہیں رہتے اور دوسروں کو بھی آگے بڑھنے سے روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔

راشد کے عمومی مزاج کے برعکس ان کے کلیات میں ایک آدھ نظم ایسی بھی مل جاتی ہے جس میں ماضی کی اہمیت تسلیم کی گئی ہے۔مثلاً 'لا=انسان' میں شامل نظم 'زمانہ خدا ہے'۔لیکن عجیب بات ہے کہ اس میں راشد نے مستقبل کے علاوہ ماضی کو بھی اہمیت دے دی مگر لمحہء موجود کو نظرانداز کر گئے۔اس نظم کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے خود 17 فروری 1968ء کو ڈاکٹر جمیل جالبی کے نام رقم کردہ خط میں لکھا ہے:

> ''یہ نظم وقت کے بارے میں چند نیم فلسفیانہ خیالات کا اظہار ہے۔یعنی حال جس سے ہمارا رشتہ ہے اور جس رشتے کا ہمیں سب سے زیادہ احساس ہے، وہی سب سے زیادہ نازک رشتہ ہے۔اصل رشتہ اس ماضی کے ساتھ ہے جس میں انسان نمودار ہوا یا اس مستقبل کے ساتھ، جہاں انسان کو پہنچنا ہے۔''(۲۲)

اب اس نظم کی چند ایک سطریں بھی ملاحظہ کیجیے:

وہ صبحیں جو لاکھوں برس پیشتر تھیں،
وہ شامیں جو لاکھوں برس بعد ہوں گی،

انھیں تم نہیں دیکھتے، دیکھ سکتے نہیں
کہ موجود ہیں، اب بھی، موجود ہیں وہ کہیں،
مگر یہ نگاہوں کے آگے جو رسّی تنی ہے
اسے دیکھ سکتے ہو، اور دیکھتے ہو
کہ یہ وہ عدم ہے
جسے ہست ہونے میں مدّت لگے گی
ستاروں کے لمحے، ستاروں کے سال! (زمانہ خدا ہے۔لا=انسان)

اس ایک آدھ استثنائی مثال کے سوا، راشد نے ماضی کو اہمیت نہیں دی۔شاید یہاں بھی استثنا اس لیے پیدا ہو گیا ہے کہ ماضی کو فلسفیانہ سطح پر دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس میں ٹھوس تہذیبی حوالے عنقا ہیں۔مجموعی طور پر ماضی کے بارے میں راشد کا سوچنے کا انداز ہمدردانہ نہیں ہے۔لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ محض ماضی کے تجربات کے سہارے حال اور مستقبل کے ہفت خواں طے نہیں کیے جا سکتے۔ماضی کے تجربوں کو بھی انھیں حتمی سمجھنے کے بجائے نئی روشنی سے متسیز کرتے رہنا چاہیے۔ایک ہی جگہ جمع شدہ پانی میں سڑاند کا پیدا ہو جانا بعید نہیں ہوتا۔حوض جوہڑ بن جاتے ہیں۔یہی حال تہذیبوں کا بھی ہوتا ہے۔اگر ان سے فیضیاب ہونا درست ہے تو ان میں تازگی پیدا کرنا بھی غلط نہیں ہے۔اس معاملے میں اعتدال و توازن بہت ضروری ہے۔اصل میں راشد کے تصوّرِ تہذیب میں ایک انتہا کا دوسرا انتہائی ردِ عمل پایا جاتا ہے۔لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ راشد نے خود اپنے تخلیقی جوہر کو تہذیبی حوالوں سے جلا دی ہے۔ان کی شاعری میں ان کا تہذیبی لاشعور جذب ہو گیا ہے۔اس ضمن میں ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے عمدہ تجزیہ کیا ہے۔لکھتے ہیں:

> ''راشد کا تہذیبی لاشعور قرونِ وسطیٰ کا ایک ایسا سحر آلود منظر نامہ ہمارے سامنے بناتا ہے جو کسی اور جدید شاعر کے ہاں نظر نہیں آتا۔یوں لگتا ہے کہ جیسے ہم ایک ٹائم ٹنل (Time Tunnal) کے ذریعے ماضی کی سمت مراجعت کرنے لگتے ہیں۔وہ سب کچھ جو کبھی تھا، ہمارے سامنے آ جاتا ہے۔ہم ایک ایسی دنیا کی حساسیت سے آشنا ہوتے ہیں جسے ہم نے کبھی کبھی دیکھا نہیں تھا۔ ...ان مظاہر کے ساتھ راشد کو محبّت ہو یا نہ ہو یہ الگ بات ہے لیکن یہ بات بہر حال ثابت ہو جاتی ہے کہ اپنے تہذیبی ماضی کے بغیر وہ اپنے حال کے تخلیقی تجربے کا اظہار بھی نہ کر سکتے تھے۔ان کو بار بار اپنے تہذیبی لاشعور سے رجوع کرنا پڑتا تھا۔جہاں سے ان کا تخلیقی تجربہ مسلسل فیضیاب ہوتا تھا۔''(۲۳)

حواشی و حوالہ جات

(ا) ن م راشد۔ماورا۔لاہور: مکتبہء اردو، 1941ء۔ص9 تا10

(۲) ن م راشد۔ لا=انسان۔ ص23 تا24

(۳) ایضاً۔ص2

(۴) ڈاکٹر وزیر آغا۔ نظم جدید کی کروٹیں۔ لاہور: ادبی دنیا، سنہ ندارد۔ ص60

(۵) وارث علوی۔ اے پیارے لوگو۔ نئی دہلی: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، 1981ء۔ ص228 تا229

(۶) ن م راشد۔ ماورا۔ لاہور: مکتبہء اردو، 1941ء۔ ص24 تا25

(۷) ن م راشد۔ لا=انسان۔ ص24

(۸) بحوالہ، شعروحکمت۔ حیدر آباد دکن: ن م راشد نمبر۔ ص231

(۹) نیادور۔ کراچی: ن م راشد نمبر۔ ص161

(۱۰) ایضاً۔ص163

(۱۱) ایضاً۔ص71 تا72

(۱۲) شعروحکمت۔ حیدر آباد دکن: ن م راشد نمبر۔ ص53

(۱۳) ڈاکٹر وزیر آغا۔ نظم جدید کی کروٹیں۔ ص68

(۱۴) نئی قدریں۔ حیدر آباد سندھ: جلد19، شمارہ4-5، شاعر نمبر، 1967ء۔ ص128

(۱۵) وارث علوی۔ اے پیارے لوگو۔ ص238

(۱۶) تفصیل کے لیے دیکھیے راقم کا مضمون ''راشد کی شخصیت کے مذہبی رنگ'' مشمولہ، دریافت۔ اسلام آباد: شمارہ8، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، جنوری2009، ص172 تا180

(۱۷) سوغات۔ بنگلور: شمارہ7، 1995ء۔ ص267

(۱۸) شعروحکمت۔ حیدر آباد دکن: ن م راشد نمبر۔ ص59

(19) Annual of Urdu studies. Chicago: 1985. Page 33

(۲۰) ڈاکٹر تبسم کاشمیری۔ لا=راشد۔ ص94

(۲۱) ن م راشد۔ لا=انسان۔ ص19

(۲۲) نیادور۔ کراچی: ن م راشد نمبر۔ ص219

(۲۳) ڈاکٹر تبسم کاشمیری۔ لا=راشد۔ ص17 تا18، 24